عام انسانی تعلقات

(حسنِ سلوک کی عمومی ہدایات)

یہ بات واضح ہے کہ قرآن مجید نے غیر مسلم والدین کے ساتھ حسن سلوک کا بالفاظِ صریح حکم دیا ہے۔ اسی طرح غیر مسلم رشتہ دار بھی ازروئے شرع حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ ان کے قانونی حقوق بھی ہیں۔ جن غیر مسلموں سے خون اور رشتہ کا تعلق نہیں ہے، ان کے سلسلے میں عمومی ہدایات ہیں، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ بعض اخلاقی ہدایات مسلمانوں کو خطاب کر کے دی گئی ہیں، لیکن ان ہدایات پر عمل مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے سلسلے میں بھی ہوگا، دونوں کے ساتھ الگ الگ رویہ نہیں اختیار کیا جائے گا۔ خاص بات یہ کہ غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کے ذیل میں بعض شبہات کو رفع بھی کیا گیا ہے۔ ذیل میں ان پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

قرآن مجید میں والدین اور قرابت داروں کے علاوہ یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کی مذمت کی گئی ہے[1]۔ یہ عام حکم ہے۔ اس لیے حسن سلوک ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مطلوب ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے، جس

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' باب 'خدمت کے یہ مستحق ہیں'۔

کسی کے ساتھ بھی غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے گا وہ غیر اسلامی رویہ ہوگا۔

قرآن مجید کی ان عمومی تعلیمات میں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے۔ اس کا تعلق فرد اور ریاست دونوں سے ہے۔ اس میں جنگی نفسیات اور سیاسی نزاکتیں بھی شامل ہوجاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے ان کے ساتھ جو مہذب اور شریفانہ رویہ اختیار کیا اس سے بہ آسانی ان عمومی تعلیمات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

انسان جب خدا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھتا ہے تو اس کے ہاتھوں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق محفوظ نہیں رہ پاتے۔ وہ کم زوروں، ناداروں، یتیموں اور مسکینوں پر ستم ڈھانے اور ان کے حقوق پر دست درازی کرنے لگتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہی گئی ہے[1] اس کے برخلاف خدا کے نیک بندوں کا کردار وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْناً وَّ يَتِيْماً وَّ اَسِيْراًo اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْراًo

(الدھر: ۸-۱۰)

اور وہ کھانا کھلاتے ہیں، اس کی خواہش اور طلب کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں، تم سے کسی بدلہ یا شکریہ کے طالب نہیں ہیں۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا ڈر ہے جو سخت مصیبت والا اور طویل ہوگا۔

معاشرہ کے کم زور افراد کو کھانا کھلانا، خدا کے نیک بندوں کے مجموعی کردار کی محض ایک علامت ہے۔ اس سے ان کی پوری زندگی کا رخ سمجھا جاسکتا ہے۔ یہاں اسی پہلو سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کم زوروں کو بے سہارا نہیں چھوڑتے،

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔ سورۃ الفجر: ۱۷-۱۹، سورۃ البلد: ۱۱-۱۷، سورۃ المدثر: ۴۴۔ اس کی پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ 'کم زور- اسلام کے سایہ میں' مطبوعہ ماہ نامہ 'زندگی' رام پور، اگست تا دسمبر ۱۹۷۸

مشکلات میں ان کے کام آتے ہیں، ان کو کھلاتے پلاتے اور ان کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔

یہاں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ قیدیوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ یتیم اور مسکین چاہے اپنے ہوں یا پرائے، ان کا تعلق کسی بھی قوم اور طبقہ سے ہو، ان کی بے کسی اور مظلومی کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہی احساس آدمی کے اندر ان سے ہمدردی کے جذبات ابھارتا ہے۔ وہ ان کی مدد کرے یا نہ کرے، انھیں مدد کا بہرحال مستحق سمجھتا ہے۔ صرف شقی القلب اور خودغرض انسان ہی ان جذبات کو دبا سکتا ہے۔ لیکن قیدیوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ سیاسی مجرم سمجھے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کا وہ جذبہ عام حالات میں مفقود ہوتا ہے جو کسی یتیم یا مسکین کے سلسلے میں پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قیدیوں کے ساتھ دنیا میں بہت ہی برا سلوک ہوتا رہا ہے، انھیں سخت سے سخت اذیتیں دی جاتی تھیں، وہ کال کوٹھریوں میں پڑے پڑے ختم ہوجاتے تھے، باہر نکلتے تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ہوتی تھیں، ان کی ضروریات کی تکمیل کی کوئی متعین صورت نہ تھی۔ بسا اوقات بھیک پر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔ ان حالات میں اسلام نے اپنے ماننے والوں کے اندر قیدیوں کے مجرم اور گناہ گار ہونے سے زیادہ ان کے انسان اور ہمدردی کے مستحق ہونے کا جذبہ ابھارا۔

یہ آیت سورۂ دہر کی ہے۔ عام طور پر علماء نے اسے مدنی قرار دیا ہے۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، مقاتل، کلبی اور یحییٰ بن سلام نے اسے مکی کہا ہے۔ اس کی تائید سورہ کے مضامین سے ہوتی ہے۔ مکہ کے اصحابِ ثروت اور زیرپرست مسکینوں اور یتیموں کے ساتھ جس شقاوت اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے، قیدیوں کے ساتھ ان کا سلوک اس سے مختلف نہیں رہا ہوگا۔ اسلام نے اس پورے رویہ پر تنقید کی اور اللہ کے نیک بندوں کی تعریف کی کہ وہ ظلم و جور کے شکنجہ میں کسے ہوئے قیدیوں کو اپنی محبت اور حسنِ سلوک سے راحت پہنچا رہے ہیں۔ یہ بات جس پس منظر میں کہی گئی ہے اور عملاً

جوصورت حال تھی اس میں مسکین، یتیم اور قیدی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم ہی تھے۔ مکی دور میں گو مسلمان بہت تھوڑی تعداد میں تھے، لیکن ان کی یہ تصویر ابھر کر سامنے آرہی تھی کہ ان کم زوروں کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردی، محبت اور انسان دوستی کا ہے۔

مشہور تابعی مفسر عکرمہ نے 'اسیر' سے غلام مراد لیا ہے۔[1]

غلامی بھی ایک طرح کی قید ہی ہے۔ قرآن مجید نے بندِ غلامی کو توڑنے اور غلاموں کو آزاد کرنے کی تحریک شروع کی اور ترغیب وتشویق کے ذریعہ اسے آگے بڑھایا۔

مدینہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو اللہ کے ان نیک بندوں نے قیدیوں کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا اس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ 'اسیر' سے اس آیت میں کس قسم کے قیدی مراد ہیں؟

ہر ریاست بعض خاص قسم کے جرائم کے ارتکاب پر اپنے شہریوں کو قید و بند کی سزا دیتی ہے۔ یہ شہری یا ملکی قیدی ہیں۔ ریاست حالتِ جنگ میں ہو تو دشمن کے افراد بھی قیدی بنائے جاتے ہیں۔ انھیں غیر ملکی قیدی کہا جاسکتا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں دونوں طرح کی رائیں ملتی ہیں۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

الاسیر من اھل الشِّرک یکون فی ایدیھم. اسیر وہ ہے جس کا تعلق مشرکین سے ہے، جو مسلمانوں کے ہاتھ میں (قیدی) ہے۔

یہی تفسیر قتادہؒ اور سعید بن جبیرؒ نے کی ہے۔ حضرت قتادہؒ کہتے ہیں:

---

[1] ابن کثیر، تفسیر: ۴/ ۴۵۵

[2] ابن جریر، تفسیر: جزء ۲۹، ص ۱۲۹، ۱۳۰

لقد امر اللّٰہ بالاُسری ان یحسن الیھم و ان اسراھم یومئذ لاھل الشرک[۱]

اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور اس دور میں ان کے قیدی اہل شرک ہی ہوتے تھے۔

ابن جریج کہتے ہیں:

لم یکن الاُسیر یومئذ الّا من المشرکین.

اس زمانہ میں قیدی مشرکین ہی میں سے ہوتے تھے۔

علامہ ابوعبید اس قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

یرید ان اللّٰہ تعالیٰ قد حمد علی اطعام المشرکین[۲]

ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو کھلانے پر تعریف کی ہے۔

حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کہتے ہیں کہ 'اسیر' اہل قبلہ (مسلمان) اور غیر اہلِ قبلہ (غیر مسلم) دونوں ہی ہوسکتے ہیں۔

امام قرطبی نے اسے ایک جامع قول قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: مشرک قیدی کو کھانا کھلانا بھی اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے، البتہ اس پر خرچ فرض صدقات سے نہیں، نفل صدقات سے ہوگا۔[۳]

امام ابن جریر طبری کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ 'اسیر' کا لفظ عام ہے۔ وہ حربی بھی ہوسکتا ہے، جو جنگ میں گرفتار ہوتا ہے اور اہل قبلہ میں سے بھی ہوسکتا ہے، جسے کسی جرم میں گرفتار کیا گیا ہو۔ یہاں نیک بندوں کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ محض اللہ کی رضا اور اس سے تقرب کے لیے اور جذبہ رحم سے انھیں کھلاتے ہیں۔

آگے فرماتے ہیں۔ یہ بات قیامت تک کے لیے ہے۔[۴]

---

۱ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۹/ ۱۲۹

۲ ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳.

۳ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۹/ ۱۲۹

۴ ابن جریر، تفسیر: جزء ۲۹، ص ۱۳۰

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ یہاں 'اسیر' سے مراد مشرک قیدی ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان قیدی کو علی الاطلاق 'اسیر' نہیں کہا جاتا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ قیدی کو کھانا کھلانا، اللہ سے تقرب کا ذریعہ ہے۔ آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرک قیدیوں پر ہر طرح کے اموالِ صدقات صرف کیے جاسکتے ہیں، لیکن (جیسا کہ پہلے گزر چکا) ہمارے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ اس سے وہ صدقات مستثنیٰ ہیں، جن کے وصول کرنے کا حق حاکم کو ہے[1]

رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ان تعلیمات کا عملی ثبوت ہے۔

جنگ بدر میں مشرکین کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر ہی قیدی بنائے گئے[2] رسول اللہ نے قیدیوں کو صحابہ کرامؓ کے درمیان تقسیم کر دیا اور نصیحت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے[3] اس پر عمل جس طرح ہوا اس کا ذاتی تجربہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابوعزیر بن عمیر کی زبانی سنئے:

وہ اس جنگ میں نضر بن حارث کے بعد مشرکین کے علم بردار تھے۔ فرماتے ہیں کہ انھیں بعض انصار کے حوالے کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی نصیحت کا ان پر یہ اثر تھا کہ صبح و شام کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے۔ ان میں سے کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ملتا تو مجھے دے دیتا، اسے ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ اس سے مجھے

---

[1] احکام القرآن: ۳/۵۷۹

[2] بخاری، کتاب المغازی۔ ابن ہشام میں ہے کہ قیدی ستاون تھے۔ ان میں بنیش تر کا نام بنام ذکر ہے۔ ابن ہشام ۲/ ۳۶۴-۳۶۷۔ قیدیوں کی تعداد میں اور بھی اختلافات ہیں، بخاری کی روایت صحیح اور معتبر ہے۔ ملاحظہ ہو ابن کثیر۔ السیرۃ النبویۃ ۲/ ۴۵۶، ۴۶۳

[3] ماوردی نے ایک کم زور سی روایت نقل کی ہے کہ مہاجرین میں سے سات افراد نے بدری قیدیوں کی کفالت کا بوجھ اٹھایا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ حضرات ابوبکر، عمر، علی، زبیر، عبد الرحمٰن بن عوف، سعید بن العاص اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم۔ ماردی، النکت والعیون: ۴/ ۳۷۰۔ انصار کے سلسلے کی تفصیل نظر سے نہیں گزری۔

شرم سی محسوس ہوتی تھی[1]

یہ جنگ بدر کے قیدیوں کا ذکر ہے۔ اور قیدیوں کے ساتھ بھی یہی مہذب اور شریفانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یؤتی بالأسیر فیدفعہ الی بعض المسلمین فیقول احسن الیہ فیکون عندہ الیومین والثلاثۃ فیوثرہ علی نفسہ[2]	رسول اللہ ﷺ کے پاس قیدی لایا جاتا تو آپ اسے کسی مسلمان کے حوالہ کردیتے اور فرماتے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ یہ قیدی اس کے پاس دو تین دن رہتا اور وہ مسلمان اس کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا تھا۔

جنگ بدر کے قیدیوں ہی کے سلسلہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو میں سہیل بن عمرو کے اگلے دانت توڑ دوں، تاکہ اس کی زبان باہر نکل آئے اور وہ پھر کہیں آپ کے خلاف اپنی خطابت کا مظاہرہ نہ کرسکے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں (اس طرح کی) سزا دوں تو اللہ تعالیٰ مجھے بھی سزا دے سکتا ہے، گوکہ میں نبی ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے: ممکن ہے کہ کل وہ کسی ایسی حیثیت میں ہو جو تمہارے لیے ناگوار نہ ہو[3]

اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں ملکی قیدیوں اور قید خانوں کے متعلق قوانین موجود ہیں اور اصلاحات ہوئی ہیں، جنگی قیدیوں کے بارے میں بھی بعض بنیادی اصول تسلیم کیے جاتے ہیں، لیکن ایک تو ان کا چرچا زیادہ ہے، پابندی کم ہے، دوسرے یہ کہ ان اصلاحات اور قوانین کا تعلق ریاست سے ہے، عوام ان سے غیر متعلق رہتے ہیں، انھیں ان سے دلچسپی نہیں پیدا ہوتی۔ اسلام نے ریاست کے ساتھ اس کے ایک ایک فرد میں قیدیوں سے ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ اس کے نتیجے میں تاریخ نے یہ

---

[1] ابن ہشام: سیرۃ النبی: ۲/۲۵۶، ۲۵۷ [2] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/۱۹۶
[3] ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲/۲۶۰، ۲۶۱

کارنامہ دیکھا کہ جو قوم اسلام کے ماننے والوں سے برسر پیکار تھی اور جو انھیں ختم کرنے اور مٹانے کے درپے تھی، اس کے افراد جب میدان جنگ سے گرفتار ہوکر آئے تو انھوں نے خود تکلیف اٹھا کر ان قیدیوں کو راحت پہنچائی، خود بھوکے رہے یا روکھی سوکھی کھا کر انھیں اچھا کھلایا پلایا، ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھا۔ ان کی یہ ساری خدمت بے لوث اور بے غرض تھی، وہ نام ونمود نہیں چاہتے تھے، انھیں کسی صلہ کی تمنا نہ تھی۔ ان کے سامنے صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوش نودی تھی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اسی کے لیے کرتے تھے۔

اس طرح اسلام نے بتایا کہ غیر ملکی اور دشمنوں کے صف سے گرفتار ہونے والے قیدی بھی بہتر سلوک کے مستحق ہیں، ان کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کرنا اور انھیں ذہنی اذیت پہنچانا ناروا ہے۔ وہ گو دشمن ہیں، لیکن انسان ہیں۔ جب وہ اپنے حقوق حاصل کرنے میں آزاد نہیں ہیں تو ان کے انسانی حقوق کا احترام ہمارا فرض ہے۔ ریاست کو یہ حق بھی ہے کہ اگر اس کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ کے انھیں آزاد کردے۔ یہ سب باتیں اسلام کے قوانینِ جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ ان سے دنیا نے جنگ وصلح کے بین الاقوامی اصول وآداب سیکھے اور بہت سی اصلاحات کیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں تو دشمن کے قیدیوں کے ساتھ اس حسن سلوک کا ذکر ہو رہا ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی اور جس کا عملی نمونہ اس کے ماننے والوں نے پیش کیا۔

بعض لوگوں نے سورۂ دہر کی زیر بحث آیت کا تعلق مسلمان قیدیوں سے بھی جوڑا ہے، ظاہر ہے، برسرِ پیکار دشمن اور غیر ملکی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے، مسلمان قیدیوں کے سلسلے میں اس سے بہتر رویہ ہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ حضرت قتادہؒ کہتے ہیں:

کان اسیرھم یومئذ المشرک و اس وقت ان کے قیدی مشرک تھے (ان کے

اخوک المسلم احق ان تطعمہ[1] ساتھ یہ حسن سلوک رہا) تمہارا بھائی جو مسلم ہے وہ تو اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اسے کھلاؤ پلاؤ (اور اس کی ضروریات کا خیال رکھو)۔

امام ابو یوسفؒ نے قیدیوں کے سلسلے میں خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو فساد، فسق و فجور اور چوری وغیرہ کسی جرم میں گرفتار کیا جائے تو اگر وہ صاحب حیثیت ہے تو اسی کے مال سے اس پر خرچ کیا جائے، لیکن نادار ہے اور زندہ رہنے کا سامان نہیں کرسکتا تو اس پر صدقہ کیا جائے، یا بیت المال سے اس پر صرف کیا جائے، دونوں ہی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں، لیکن میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ بیت المال اس کا خرچ برداشت کرے۔

مزید فرماتے ہیں کہ جب ایک مشرک قیدی کو کھلانا پلانا اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے تو مسلمان کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسے بھوک سے مرنے کے لیے کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟

مسلمان خلفاء، قیدیوں کے کھانے پینے اور سردی گرمی میں ان کے لباس کا نظم کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت علی بن ابی طالبؓ نے عراق میں اور پھر حضرت معاویہؓ نے شام میں اس پر عمل کیا۔

اس کے بعد امام ابو یوسفؒ نے قید خانوں کی اصلاح کی تجاویز پیش کی ہیں[2]

اسلام کی روح یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی اور شہری قیدیوں کے ساتھ بھی بہتر سے بہتر سلوک ہو۔ اسلامی تاریخ اسی کا ثبوت فراہم کرتی رہی ہے۔ اس کے لیے جو قواعد وضوابط بنائے جائیں، ان میں یہی روح کارفرما ہونی چاہیے۔

غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات

اسلام کی عمومی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے ایک اور مثال غیر مسلم پڑوسیوں سے

---

[1] ابن جریر طبری، تفسیر: جزء ۲۹، ص ۱۳۰۔ زمخشری، الکشاف: ۴/ ۱۹۶

[2] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۴۹-۱۵۱

تعلقات کی ہے۔

انسان کا عملاً سب سے قریبی تعلق اس کے پڑوس سے ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا مضبوط ہو وہ اتنا ہی سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ پڑوسی اس کے لیے خطرہ نہیں ہے، اس سے اسے کوئی نقصان اور گزند نہیں پہنچے گا، بلکہ اس کی جان مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی اور وہ اس کے دکھ درد اور آسائش و راحت میں شریک ہوگا تو وہ یک سوئی اور دل جمعی کے ساتھ کاروبارِ حیات میں اپنی ذمے داری ادا کرسکتا ہے، ورنہ وہ سخت دشواریوں سے گزرے گا۔ اسلام نے انسان کو بہترین پڑوسی بننے کی تعلیم دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

مَن کان یومن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلا یؤذ جارہٗ[1] — جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے اپنے پڑوسی کو اذیت نہیں پہنچانی چاہیے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میرے محبوب (ﷺ) نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اپنے پڑوسیوں میں سے، جس کے گھر ضرورت ہو اس میں سے کچھ اسے بھیج دو۔[2]

پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم عام ہے۔ اس کے مستحق مسلمان پڑوسی کی طرح غیر مسلم پڑوسی بھی ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ہاں بکری ذبح ہوئی تو آپ نے گھر والوں سے ایک سے دو بار دریافت کیا کہ ہمارے فلاں یہودی پڑوسی کو اس میں سے کچھ بھیجا ہے؟ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل مجھے پڑوس کے سلسلے میں اس قدر تاکید کرتے تھے کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ اسے وارث نہ بنا دیں۔[3]

اس حدیث کے حوالے سے علامہ رشید رضا مصری کہتے ہیں:

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق الجوار

[2] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ

[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق الجوار

هٰذا دلیل علٰی ان ابن عمر فهم من الوصایا المطلقة فی الجار انها تشمل المسلم و غیر المسلم و ناهیک بفهمه و علمه[1]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے پڑوس کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلے میں جو مطلق تاکیدیں آئی ہیں ان سے یہ سمجھا کہاں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا علم وفہم تمھارے لیے کافی ہونا چاہیے۔

اس کے بعد پڑوسیوں کا حق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و من الاحسان الی الجار الاهداء الیه و دعوته الی الطعام و تعاهده بالزیارة و العیادة[2]

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بھی شامل ہے کہ اسے ہدیہ اور تحفہ دیا جائے، کھانے پر بلایا جائے اور ملاقات اور عیادت کے ذریعے اس کی خبر گیری کی جاتی رہے۔

قرآن مجید میں پڑوسی کی ایک قسم 'الجار الجنب' بتائی گئی ہے۔ بعض علماء نے اس سے یہودی اور نصرانی مراد لیے ہیں۔ اس حوالے سے علامہ قرطبی کہتے ہیں:

فالوصاة بالجار ما مور بها مندوب الیها مسلما کان او کافرا[3]

پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے۔ یہ مندوب اور پسندیدہ ہے۔ پڑوسی چاہے مسلمان ہو یا کافر۔

اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات عام ہیں، ان کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے۔ ان پر عمل جس طرح اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ ہوگا اسی طرح دیگر مذاہب والوں کے ساتھ بھی ہوگا۔

مسلمانوں سے متعلق ہدایات میں غیر مسلم بھی داخل ہیں

قرآن وحدیث کی بہت سی تعلیمات وہ ہیں، جو مسلم معاشرہ کے پیش نظر دی گئی ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے؟ لیکن معنوی لحاظ سے یہ عام ہدایات ہیں، ان سے غیر مسلم خارج نہیں ہیں۔

---

[1] رشید رضا، تفسیر المنار: ۵/ ۹۲ [2] حوالہ سابق
[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵/ ۱۸۴

ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیے وہی سلوک غیر مسلم کے ساتھ بھی اس کا ہونا چاہئے۔ دونوں کے سلسلے میں دو الگ رویے وہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اس طرح کی دو ایک تعلیمات کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

مسند احمد، امام بخاری کی الادب المفرد، طبرانی اور بیہقی میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اجیبوا الداعی ولاَ تردّوا الهدية ولاَ تضربوا المسلمين.

دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرو، ہدیہ کو واپس مت کرو اور مسلمانوں کو زد و کوب مت کرو۔

دعوت اور ہدیہ قبول کرنے کے کچھ آداب ہیں۔ یہاں ان کا ذکر نہیں ہے۔ آخری فقرہ ہے 'ولاَ تضربو المسلمين' علامہ مناوی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: مسلمانوں کو مت مارو سوائے اس کے کہ ان پر کوئی حد لازم آجائے یا کسی غلطی پر تادیب کرنی پڑے۔ ان کے ساتھ لطف و محبت کا معاملہ کرو۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا اسوہ تھا۔ آپ نے کسی خادم یا غلام یا لونڈی کو اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں مارا۔ تقویٰ سے قریب تر رویہ یہ ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیا جائے۔ مسلمان کو بلا وجہ مارنا گناہ کبیرہ ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

و التعبير بالمسلم غالبی فمن له ذمة او عهد معتبر يحرم ضربه تعديًا[1]

مسلمان کا ذکر غالب صورت حال (مسلم معاشرہ) کے پیش نظر ہے، ورنہ اسلامی ریاست میں جو ذمی ہے یا جس کے ساتھ معتبر عہد و پیمان ہے، ناحق اسے مارنا بھی حرام ہے۔

کسی مسلم یا غیر مسلم کو زد و کوب کرنا غلط اخلاقیات کی ایک مثال ہے۔ اس سے اس حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کسی بھی غلط اخلاقی رویہ کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔ ایک مسلمان کا جو رویہ ہونا چاہیے اس کا اندازہ ایک دوسری حدیث سے ہوتا ہے۔

---

[1] مناوی، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر: ۱/ ۱۶۴

ابن ماجہ کی روایت ہے۔

اذا استشار احدکم اخاہ فلیشر علیہ تم میں سے کسی سے اس کا بھائی مشورہ کرے تو اسے (صحیح) مشورہ دے۔

علاوہ مناوی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے کسی دینی معاملہ میں مشورہ طلب کرے تو جو بات اس کے حق میں بہتر ہو اسی کا مشورہ دے، ورنہ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے ساتھ خیانت ہوگی۔ اس لیے خیر خواہی لازم ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

ذکر الأخ غالبی، فلو استشار ذمی کان کذٰلک[1] بھائی کا ذکر غالب صورت حال (مسلم معاشرہ) کی بنا پر ہے۔ اگر کوئی ذمی مشورہ کرے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام نے غیر مسلموں سے ربط و تعلق سے کہیں منع نہیں کیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کی ہدایت یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا جائے، ان سے خونی رشتہ ہو تو اس کا احترام کیا جائے، بہ حیثیت انسان ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔ وقت ضرورت ان کی خدمت کرنا اور ان کے دکھ درد میں کام آنا اس کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل اور کارِ ثواب ہے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ ذہنی تحفظات تھے تو اسلام نے انھیں رفع کیا ہے اور کسی قسم کے شک و شبہ کو باقی رہنے نہیں دیا ہے۔

غیر مسلموں پر خرچ کرنا بھی خدا کی راہ میں انفاق ہے

قرآن مجید نے اس خیال کی اصلاح کی کہ انفاق صرف مسلمانوں پر ہونا چاہئے۔ اس نے واضح کیا کہ غیر مسلموں کے دکھ درد میں کام آنا اور ان کی مالی مدد کرنا بھی راہِ خدا میں انفاق ہی کی ایک صورت ہے۔

---

[1] مناوی، فیض القدیر: ۱/ ۲۷۵

سورۂ بقرہ میں ایک جگہ راہِ خدا میں انفاق کا ذکر ہے، اس کی ترغیب ہے، اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ خرچ کرنے اور نام ونمود اور ریاکاری سے بچنے کی تاکید ہے، کھلے چھپے ہر طریقہ سے انفاق کا حکم ہے، خاص طور پر ان لوگوں کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت ہے جو دست سوال دراز نہیں کرتے۔ (آیت ۲۶۱ تا ۲۷۴) عین ان تفصیلات کے بیچ میں ایک آیت آئی ہے جو قابل غور ہے او رہمارے موضوع سے اس کا خاص تعلق ہے۔ ارشاد ہے:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ○ (البقرۃ:۲۷۲)

(اے پیغمبرؐ!) آپ پر ان کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔ تم جو بھی مال اللہ کی راہ میں خرچ کروگے اس کا فائدہ تم ہی کو پہنچے گا۔ (دیکھو) تم اللہ کی رضا ہی کے لیے تو خرچ کرتے ہو۔ تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اس کا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی نہ ہوگی۔

یہ آیت یہاں کیوں آئی ہے؟ اس کا اصل مضمون سے کیا تعلق ہے؟ اس بارے میں تفسیر میں متعدد روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت تھی کہ مسلمان جو کچھ صدقہ وخیرات کریں وہ مسلمانوں پر کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

ایک روایت میں اس ممانعت کی وجہ بھی بیان ہوئی ہے۔ سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ ذمیوں میں جو حاجت مند ہوتے مسلمان ان پر انفاق کیا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں ہی میں حاجت مندوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا:

لاَ تتصدقوا الاّ علی اھل دینکم — اپنے ہم مذہب لوگوں ہی پر تم صدقہ وخیرات کرو۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان لوگوں پر بھی خرچ کرنے کی اجازت دی گئی

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۱/ ۳۲۳، ۳۲۴

جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں[1]

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے۔ فرماتے ہیں: انصار کے رشتے بنو قریظہ اور بنو نضیر سے تھے۔ انصار ان پر اپنا مال خرچ کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان پر خرچ کیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]

یہ روایت بتاتی ہے کہ پس منظر میں یہود اور ان سے تعلقات تھے۔ گویا آیت نے ہدایت کی کہ ان کے نادار بھی حسن سلوک کے مستحق ہیں اور ان پر بھی انفاق ہونا چاہیے۔ بعض دوسری روایات میں اس پس منظر کے ساتھ مشرکین کا ذکر ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ہی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مشرکین پر انفاق نہیں فرمایا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[3]

یہی بات صحابہ کرامؓ کے بارے میں بھی کہی گئی ہے کہ وہ اپنے مشرک قرابت داروں پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کی اجازت انھیں دے دی گئی[4]

حضرت قتادہؒ ایک عمومی بات بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے بعض صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ جو لوگ ہمارے ہم مذہب نہیں ہیں، کیا ان پر انفاق کیا جاسکتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[5]

اسلام کی جس طرح ہر طرف سے مخالفت ہو رہی تھی اور اس کے ماننے والے جس طرح جور وستم کا نشانہ بنائے جا رہے تھے، اس کے خلاف مسلمانوں کے اندر ردّ عمل

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۳/ ۳۲۷

[2] ابن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن ۵/ ۵۸۸، طبع جدید

[3] ابن جریر: ۵/ ۵۸۷

[4] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۴/ ۱۹۱، نیز ابن جریر، حوالہ سابق

[5] ابن جریر: ۵/ ۵۸۸

کا پایا جانا غیر فطری نہ تھا۔ ان کے دل میں کبھی یہ سوال ابھرتا ہوگا کہ ان کے خویش و اقارب اور دور و نزدیک کے لوگ آخر اس دین کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں جس میں سب کی صلاح و فلاح کا سامان ہے؟ کبھی یہ سوچتے ہوں گے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں ہمدردی کی جائے اور مشکلات میں ان کی مدد کی جائے جو زندگی بھر ہمارے راستے میں کانٹے بچھاتے اور ناوک فگنی کرتے رہے؟ کبھی یہ خیال آتا ہوگا کہ ان دشمنانِ دین کے ساتھ تعاون کا کوئی اجر و ثواب بھی ہے یا نہیں؟ کبھی یہ خواہش موج زن ہوتی ہوگی کہ کاش یہ ایمان لے آتے اور ہم اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیتے۔ اوپر کی روایات ان سب کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے انفاق اور اس کے تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے اس جذبہ کی بھی اصلاح کی ہے کہ تعاون اور ہمدردی کے مستحق صرف اپنے ہم مذہب افراد ہیں اور ان ہی کے ساتھ حسن سلوک ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ انسانوں کی خدمت کی راہ میں عقیدہ و خیال اور دین و مذہب کے اختلاف کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ جو شخص ضرورت مند ہے اس کی مدد کرنا دینی اور اخلاقی فرض ہے، چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مشرک ہو یا اہلِ کتاب، رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار۔ آدمی کی یہ خواہش یا اصرار کہ لوگ ایمان لے آئیں تو ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے اندر طلب صادق پائی جاتی ہے اسے وہ اس دولت سے نوازتا ہے۔ آدمی یہ سوچ کر انسانوں کی خدمت اور فلاح و بہبود کے کام کرتا چلا جائے کہ اس کا اجر و ثواب اللہ نے چاہا تو محفوظ ہے اور کل وہ اس کے کام آئے گا۔ اس پورے پس منظر کے ساتھ آیت ان بہت سے الزامات کی تردید کرتی ہے، جو اسلام کے کردار پر کیے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مسلم و غیر مسلم ہر فرد اور ہر طبقہ پر صدقہ و خیرات کی ہدایت فرما دی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فامر بالصدقة بعدها على كل من سألک من كل دين[1] اس آیت کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ کسی بھی دین کا ماننے والا تم سے سوال کرے تو اس پر خرچ کرو۔

اس سلسلے کی ایک اور روایت ہے:

تصدقوا على اهل الاديان[2] تمام اہلِ مذاہب پر صدقہ وخیرات کرو۔

حضرت سعید بن مسیّبؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی گھرانے پر صدقہ کیا تھا جو بعد میں بھی جاری رہا۔[3]

اس آیت کے سیاق وسباق سے بحث کرتے ہوئے علامہ قرطبی کہتے ہیں:

هٰذا الكلام متصل بذكر الصدقات فكانه بيّن فيه جواز الصدقة على المشركين[4] یہ آیت صدقات کے ذکر سے ملی ہوئی ہے۔ گویا اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشرکین پر صدقہ کرنا جائز ہے۔

اس بحث کا تعلق مسئلہ کے اخلاقی پہلو سے ہے۔ آیئے، اب ذرا اس کے فقہی اور قانونی رخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے مال کا کتنا اور کون سا حصہ غیر مسلموں کی مدد اور ان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں خرچ کرسکتا ہے اور کون سا حصہ خرچ نہیں کرسکتا؟

اسلامی شریعت میں صدقات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو فرض اور واجب ہیں اور دوسرے وہ جن کی نوعیت فرض یا واجب کی تو نہیں ہے، لیکن اللہ کی رضا کے لیے کیے جاتے ہیں۔ فرض صدقات میں سب سے پہلے زکوٰۃ کا سوال سامنے آتا

---

[1] ابن کثیر، تفسیر: ۱/ ۳۲۴

[2] رواہ ابن ابی شیبہ عن سعید بن جبیر مرسلاً (نصب الرایۃ لاحادیث الہدایۃ: ۲/ ۳۹۸)

[3] ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳۔ نصب الرایۃ: ۲/ ۳۹۸

[4] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۲/ ۳۳۷

ہے۔ زکوٰۃ مال کی ایک خاص مقدار یا نصاب پر فرض ہوتی ہے۔ یہ صاحبِ نصاب مسلمانوں سے لی جاتی ہے اور متعین مدات میں غریب مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی ہے۔ علاّمہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اموالِ زکوٰۃ غیر مسلم پر صرف نہیں ہوں گے[1] دوسرے صدقات کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

صدقۂ فطر رمضان المبارک کے ختم ہونے پر ہر صاحبِ حیثیت یا فقہ حنفی کی رو سے ہر صاحب نصاب مسلمان پر واجب ہوتا ہے۔ یہ صدقہ اسے اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرنا ضروری ہے۔

صدقۂ فطر کے بارے میں امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کے حکم میں ہے، لہٰذا اسے زکوٰۃ ہی کی طرح مسلمانوں پر صرف ہونا چاہیے، لیکن امام ابوحنیفہ ذمیوں پر بھی اس کے صرف کو جائز سمجھتے ہیں۔ عمرو بن میمون، عمرو بن شرحبیل اور مرہ ہمدانی کے بارے میں آتا ہے کہ فطرہ کی رقم میں سے وہ راہبوں کو بھی دیا کرتے تھے[2]

ابومیسرہ کہتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس صدقۂ فطر جمع کرتے، وہ پورا کا پورا یا اس کا ایک حصہ راہبوں کو دیتے تھے[3]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے:

ولاَ یجوز ان یدفع الزکوٰۃ الی ذمی و یدفع الیہ ما سوی ذٰلک من الصدقۃ[4]

کسی ذمی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے صدقات اسے دیے جاسکتے ہیں۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۴/۱۰۶، ۱۰۷

[2] ابوعبید، کتاب الاموال ص ۵۴۳۔ نیز ملاحظہ ہو ابن قدامہ، المغنی: ۴۰/ ۳۱۴، ۳۱۵

[3] ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۵۴۳

[4] ہدایہ، ج ۱، ص ۱۸۵

فطرہ کے بارے میں کہا گیا ہے:

و یؤدی المسلم الفطرة عن عبده الکافر[1] مسلمان اپنے اس غلام کی طرف سے بھی فطرہ ادا کرے گا جو کافر ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص نے فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے قرآن مجید کی بعض آیات کا حوالہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات مشرکین پر بھی کیے جاسکتے ہیں، لیکن احادیث سے ثابت ہے کہ زکوٰۃ کی تمام قسمیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''مجھے تمھارے اصحاب ثروت سے زکوٰۃ وصول کرنے اور تمہارے اصحابِ حاجت پر اسے لوٹا دینے کا حکم ہے۔'' اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جن صدقات کے وصول کرنے کا حق امام یا ریاست کو ہے وہ ذمیوں پر صرف نہیں ہوسکتے، ان کے علاوہ دوسرے تمام صدقات ذمیوں کو دیے جاسکتے ہیں، جیسے نذر کا صدقہ، غلطیوں کے کفارہ کا صدقہ، یا صدقہ فطر۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ صدقات واجبہ غیر مسلموں پر صرف نہیں کیے جاسکتے۔ اسے انھوں نے زکوٰۃ پر قیاس کیا ہے۔[2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے فقہاء کے ہاں اس مسئلے میں کتنی وسعت ہے اور انھوں نے کتنی گنجائش رکھی ہے۔

زکوٰۃ ایک چھوٹی سی مد ہے، جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کی جاتی ہے۔ دیگر صدقات واجبہ کی تعداد بھی بہت تھوڑی ہے۔ ان سے ہٹ کر انسانوں کی خدمت، تعاون اور ہمدردی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ اسلام ان سب کی ترغیب دیتا اور تشویق پیدا کرتا ہے۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

---

[1] ہدایہ، ج۱، ص۱۸۹۔ اس پر جن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے ان کی صحت وضعف پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو نصب الرایۃ: ج۲، ص۴۱۲-۴۱۴

[2] جصاص، احکام القرآن: ۵۴۷، ۵۴۸

محاربین اور غیر محاربین کے درمیان فرق

جولوگ اسلام کے نظامِ فکر وعمل سے اختلاف رکھتے ہیں وہ دوطرح کے رویے اختیار کرسکتے ہیں۔ ایک رویہ عداوت اور مخاصمت کا ہوگا۔ وہ مسلمانوں کو آزادی اور امن و سکون سے رہنے نہ دیں اور اسلامی ریاست سے ان کی جنگ جاری ہو۔ دوسرا رویہ آزادی، حریتِ فکر وعمل اور ظلم و زیادتی سے اجتناب کا ہوگا۔ اسلام نے ان دونوں رویوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ سے عام انسانی ہمدردی اور تعاون سے منع نہیں کرتا، البتہ موالات اور رازدارانہ تعلقات سے احتراز کا حکم دیتا ہے، کیوں کہ یہ چیز دشمن کو تقویت پہنچانے کے ہم معنیٰ ہے۔ جہاں تک دوسرے گروہ کا تعلق ہے اس کے ساتھ حسنِ سلوک، تعاون اور ہمدردی کی بہرحال اجازت ہے۔ اس نے اس سے منع نہیں کیا ہے[1]

سورہ ممتحنہ میں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ○ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ (الممتحنۃ:۸،۹)

اللہ تعالیٰ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[2] اللہ تعالیٰ تو تمھیں اس بات سے منع کرتا ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی، جو شخص ان سے دوستی کرے وہی ظالم ہے۔

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث 'غیر مسلموں سے عدم تعلق کے احکام کا پس منظر' کے ذیل میں آگے آرہی ہے۔

[2] اس کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے تمھارے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کی اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس آیت میں وہ کون لوگ مراد ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر ظلم و زیادتی نہیں کی اور اس طرح کا اقدام کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا؟ اس کے جواب میں سلف سے حسب ذیل رائیں ملتی ہیں:

۱- حضرت حسن بصریؒ اور ابو صالحؒ کا بیان ہے کہ یہ آیت بنو خزاعہ، بنو حرث بن کعب، کنانہ، مزینہ اور عرب کے بعض دیگر قبائل سے متعلق نازل ہوئیں، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے صلح کر رکھی تھی کہ وہ آپ سے جنگ نہیں کریں گے اور آپ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے۔

۲- بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس میں بنو ہاشم کے ان افراد کی طرف اشارہ ہے جو ان لوگوں میں شامل نہیں تھے، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا تھا۔ ان ہی میں حضرت عباسؓ بھی ہیں۔

۳- حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت غیر مسلم عورتوں اور بچوں سے متعلق ہے۔ (اس لیے کہ ان کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا)۔[1]

سلف کی ان تشریحات میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ ان میں سے ہر تشریح کسی خاص پہلو کو واضح کر رہی ہے۔ ان سب کو سامنے رکھنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

اسلامی ریاست کا جن قبیلوں، قوموں اور ملکوں سے صلح و آشتی کا معاہدہ ہوگا،

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ظلم کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا ان کے ساتھ تمھارا رویہ عدل و انصاف پر مبنی ہونا چاہیے۔ یہ بات ناانصافی کی ہوگی کہ انھیں بھی دشمنوں کی صف میں رکھا جائے اور دونوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا جائے۔ اس کا ایک اور مفہوم ابن عربی مالکی نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قسط سے مراد یہاں عدل نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی حصہ کے بھی آتے ہیں۔ یہی اس جگہ مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حسن سلوک اور صلہ رحمی کی خاطر اپنے اموال کا ایک حصہ ان پر خرچ کرو اس لیے کہ جہاں تک عدل کا تعلق ہے وہ محارب اور غیر محارب سب کے ساتھ واجب ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: **و تقسطوا الیھم ای تعطوھم قسطا من اموالکم و لیس یرید بہ من العدل فان العدل واجب فی من قاتل و فی من لم یقاتل**۔ احکام القرآن: ۲/ ۲۴۹

[1] آلوسی، روح المعانی، جزء ۲۸، ص ۷۵۔ نیز ملاحظہ ہو رازی، تفسیر کبیر: ۸/ ۱۳۴

ان کے ساتھ عدل و انصاف اور رواداری ہی کا نہیں، بلکہ برّو احسان کا رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جو قوم اسلامی ریاست سے برسر پیکار ہے، اس میں بھی ایسے گروہ اور طبقات ہوسکتے ہیں، جن کے دل میں اسلامی ریاست سے حریفانہ جذبات نہ ہوں اور جو اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ ان کے ساتھ بھی بہتر تعلقات رکھنے اور تعاون اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

اسی طرح محارب قوم کے وہ افراد، جو جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے (جیسے عورتیں، بچے اور معذور وغیرہ) ان کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہیں کیا جائے گا جو برسرِ جنگ افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے، بلکہ وہ ہمدردی اور لطف و محبت کے مستحق ہوں گے۔

علامہ ابن جریر طبری اس آیت کے ذیل میں سلف سے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کی بہتر اور صحیح توجیہ ان حضرات نے کی ہے جنھوں نے کہا ہے کہ کسی بھی دین و ملت کے وہ افراد جو برسرِ جنگ نہ ہوں، ان کے ساتھ عدل و انصاف اور حسنِ سلوک کیا جائے گا۔ اس میں ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان فرق نہیں کیا جائے گا۔ آیت کو منسوخ بھی نہیں کہا جاسکتا، اس لیے کہ اہل حرب میں سے کسی سے قرابت اور رشتہ داری ہو یا نہ ہو، اس کے ساتھ نیکی اور بھلائی ممنوع اور ناجائز نہیں ہے، بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کا کوئی راز ان پر نہ کھلے یا ساز وسامانِ حرب کے ذریعے انھیں تقویت نہ پہنچائی جائے۔[1]

ذمیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ ذمی اور حربی کے درمیان ایک مسلمان کے رویہ میں فرق ہوگا۔ ذمی اسلامی ریاست کا شہری ہوتا ہے اور اسے ایک طرح

---

[1] ابن جریر، تفسیر، طبع قدیم، جزء ۲۸، ص ۴۱

کا معاہدۂ امن حاصل ہوتا ہے۔ اس کے احکام حربی کے احکام سے مختلف ہیں۔ ذمی کے دکھ درد میں کام آنا اور مشکلات میں اس کی مدد کرنا ایک اخلاقی فریضہ ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں:

''آیت کے الفاظ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ میں عموم ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمیوں کو صدقات دیے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہے جو ہم سے برسر جنگ ہیں، البتہ اس سے حربی کو صدقات دینے کی ممانعت نکلتی ہے (اس لیے کہ ریاست سے وہ حالت جنگ میں ہے)۔''[1]

محارب قوم سے انسانی تعلقات

کسی قوم سے حالت جنگ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے عام انسانی تعلقات بھی نہ رکھے جائیں اور مصیبت میں اس کے ساتھ ہمدردی نہ کی جائے اور اس کی تکلیف پر خوشی منائی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ یہ بتاتا ہے کہ دشمن اگر نازک حالات سے گزر رہا ہے اور معاشی یا کسی نوع کی ہمدردی کا مستحق ہے تو اس کے ساتھ تعاون ہونا چاہیے۔ امام محمد فرماتے ہیں:

''حربی یا ذمی کی مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ کے پاس پانچ سو درہم بھجوائے، تاکہ وہ مکہ کے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں انھیں تقسیم کردیں۔''

مزید فرماتے ہیں:

''صلۂ رحمی ہر مذہب میں پسندیدہ ہے۔ دوسروں کو ہدیہ بھیجنا مکارم اخلاق میں شمار ہوتا ہے۔''[2]

---

[1] علامہ ابوبکر جصاص کے الفاظ یہ ہیں: 'ان تبروهم و تقسطوا اليهم' عموم فی جواز دفع الصدقات الی اهل الذمة: اذ ليس هم من اهل قتالنا، فيه النهی عن الصدقة علی اهل الحرب. احکام القرآن: ۳/ ۵۳۷۔ نیز ملاحظہ ہو: روح المعانی، جزء ۲۸، ص ۷۵۔ ذمیوں کے حقوق پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔ [2] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۹۲

معاشرتی تعلقات

موجودہ دور میں انسان کی ضروریاتِ زندگی کا دائرہ بہت ہی وسیع ہوتا چلا گیا ہے اور ان میں بڑا تنوع آگیا ہے۔ آج کی تیز رفتار مادی ترقی کے ساتھ ان میں روز بروز اضافہ ہی کا امکان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بستی، شہر یا علاقہ ہی کے لیے نہیں بڑے سے بڑے ملک کے لیے بھی ان ضروریات کے سلسلے میں خود کفیل ہونا دشوار ہو رہا ہے۔ اس کے لیے ایک علاقہ کو دوسرے علاقہ سے اور ایک ملک کو دوسرے ملک سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اس طرح درآمد و برآمد ہر ملک کی ضرورت بن گئی ہے۔ ایک چیز ایک ملک میں تیار ہوتی ہے، دوسرا ملک اس کے لیے منڈی فراہم کرتا ہے۔ جن چیزوں کی ضرورت ہے یا جو چیزیں لازمۂ حیات بن گئی ہیں، ان کی پیداوار اور تیاری پر کسی خاص قوم یا ملک کی اجارہ داری نہیں ہے۔ انھیں کوئی بھی ملک تیار کرسکتا ہے اور جہاں جس قسم کی ضرورت ہو، فراہم کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ بین الاقوامی حالات اور آمد و رفت کی سہولتوں نے قوموں اور ملکوں کو قریب کر دیا ہے۔ کسی ملک کے افراد کا دوسرے ملک میں لمبی مدت تک قیام، بلکہ وہاں جا کر آباد ہو جانا بھی ناممکن نہیں رہا۔ ان حالات میں ایک مسلمان کے سامنے ان اشیاء کے استعمال کا سوال آتا ہے جنھیں غیر مسلم تیار کرتے ہیں۔ اس وقت خاص طور پر غذا اور لباس اور ان کے متعلقات زیر بحث ہیں۔ ان ہی کے ذیل میں بعض سوالات پر گفتگو کی جائے گی۔

معاشرتِ عرب کے بعض پہلو

غذا اور لباس کا تعلق تہذیب اور معاشرت سے جڑا ہوا ہے۔ دنیا کی ہر قوم کی طرح مشرکین عرب کی بھی خاص تہذیب اور معاشرت تھی، رسوم و رواج تھے، ان کی مخصوص غذائیں تھیں، ان کی تیاری کا اپنا ایک طریقہ تھا۔ خوشی کے مواقع پر تقریبات اور دعوتوں کا رواج تھا اور ہر تقریب کا الگ نام تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ عرب کی اسی تہذیب اور معاشرت میں پیدا ہوئے، صحابہ کرامؓ کا بھی اسی ملک اور اسی تہذیب سے تعلق تھا۔ آپؐ کی اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی غذا، لباس، رہن سہن اور معاشرت وہی تھی جو اہل عرب کی تھی۔

غذاؤں کی حلّت و حرمت

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی غذا کے لیے جن اشیاء کا استعمال کرتا ہے مذہب کی دنیا میں ان کی حلت و حرمت کا سوال بڑا اہم رہا ہے۔ بعض چیزیں ایک

---

[1] بعض تقریبات کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا:

١- ولیمہ: نکاح کے بعد کی تقریب۔

٢- عقیقہ: بچہ کی پیدائش پر ساتویں دن کی دعوت۔

٣- اعذار: ختنہ کے موقع پر کی جانے والی دعوت۔

٤- النقیعہ: وہ دعوت جو سفر سے بہ عافیت واپسی پر کی جائے۔

٥- الوکیرہ: مکان کی تعمیر کی خوشی میں کی جانے والی دعوت۔

٦- الجفلیٰ: دعوت عام۔

٧- النقریٰ: دعوت خاص۔

دعوت کے لیے جو کھانا تیار کیا جاتا اسے المأدبہ کہا جاتا۔

ملاحظہ ہو: ابو عمر احمد بن محمد بن عبد اللہ الاندلسی، العقد الفرید، بحث اطعمۃ العرب۔ ٦/٢٩٠-٢٩٢

متعلقہ الفاظ کی وضاحت اور تشریح کے لیے لسان العرب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان تقریبات میں سے بعض کو رسول اکرم ﷺ نے باقی رکھا۔ اس لیے انھیں سنت کا درجہ حاصل ہے۔

مذہب میں جائز اور مباح ہیں تو دوسرے مذہب میں وہ ممنوع اور حرام سمجھی گئی ہیں۔ اہل عرب بھی اشیاء کی حلت وحرمت کے قائل تھے، لیکن اس کی بنیاد زیادہ تر مشرکانہ تصورات اور اوہام وخرافات پر تھی۔ اسلام نے ان کے باطل تصورات کی اصلاح کی اور کہا کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے: (النحل:۱۱۶) اس کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۂ انعام مکی سورت ہے۔ اس میں مشرکین کے غلط رسوم و رواج اور مذہبی خیالات پر تفصیل سے جرح وتنقید ہے۔ اسی میں ارشاد ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّماً عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَماً مَّسْفُوْحاً اَوْ لَحْمَ خِنزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقاً اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○ (الانعام:۱۴۵)

کہہ دو کہ مجھ پر جو وحی آئی ہے اس میں کسی کھانے والے پر جو چیزیں کہ وہ کھاتا ہے، میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار یا بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت، اس لیے کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ جانور پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے، لیکن اگر کوئی (جان بچانے کے لیے ان محرمات کے کھانے پر) مجبور ہوجائے اور وہ حد سے نہ بڑھے اور زیادتی نہ کرے تو تمہارا رب بڑا معاف کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔[1]

اس آیت میں بعض وہ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں جنھیں اہلِ عرب حلال سمجھتے اور بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض اور چیزوں کی حرمت بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ جیسے شراب کی حرمت (المائدۃ:۹۰،۹۱) یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

---

[1] اس سلسلے کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' ص۱۰۰-۱۰۱۔

[2] قرآن وحدیث میں مطعومات ومشروبات میں کن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور کن چیزوں کی حرمت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور کن چیزوں میں کراہت پائی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۷/۱۱۵-۱۲۳

اشیاء میں اصل حلّت ہے

اشیاء کی حلّت وحرمت کے سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ اشیاء میں اصل حلّت ہے۔ حرام صرف وہی اشیاء ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ ایک مسلمان ان سے لازماً احتراز کرے گا۔ اس کے علاوہ ساری چیزیں حلال ہیں، انھیں وہ استعمال کرسکتا ہے۔ حرام وحلال کے اس فرق کے ساتھ وہ جس معاشرہ کا فرد ہے اور جہاں اس کی نشو ونما ہوئی ہے، وہاں کی غذا اس کی غذا ہوگی اور وہ جہاں بھی جائے گا اور جس ماحول میں بھی رہے گا مناسبِ حال اور اپنی پسند کی غذا استعمال کرے گا۔ جو چیزیں وہ خود کھا سکتا ہے وہ دوسروں کو بھی کھلا سکتا ہے اور ان کے ساتھ ان چیزوں کے کھانے پینے میں شریک بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا بھی فرق نہیں ہے۔ حلال چیزیں غیر مسلم تیار کریں تو ان کی خرید وفروخت اس کے لیے جائز ہوگی۔

اب آیئے اس موضوع کے بعض پہلوؤں کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے مطالعہ کیا جائے۔

غیر مسلم کا پانی پاک ہے

پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حلال اور پاک نعمت ہے۔ ہر جاندار کی حیات کا اس پر دار و مدار ہے۔ یہ نعمت سب کے لیے ہے۔ بہت سے لوگ انسانوں کے درمیان ذات پات اور رنگ ونسل کی بنیاد پر فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کوئی شخص، جسے وہ کم تر ذات کا سمجھتے ہیں، پانی کو ہاتھ لگا دے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے اور اس کا استعمال ان کے لیے ممنوع ہو جاتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پانی اصلاً پاک ہے، کسی فرد کے ہاتھ لگانے سے وہ ناپاک نہیں ہو جاتا۔ وہ ناپاک اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس میں کسی نجس اور ناپاک چیز کی آمیزش ہوجائے۔ چناں چہ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام نے غیر مسلموں کا پانی کھانے پینے، حتی کہ عبادات تک کے لیے استعمال کیا ہے۔

حضرت عمران بن حصینؓ ایک سفر کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رات میں ہم نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ صبح سب کی آنکھ لگ گئی۔ نماز قضا ہوگئی۔ فوراً بعد میں ادا کی گئی۔ ہمارے پاس پانی ختم ہوچکا تھا۔ شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے کچھ سواروں کے ساتھ مجھے پانی کی تلاش میں بھیجا۔ جب ہم نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت پانی سے بھرے ہوئے دو مشک اپنی اونٹنی پر لیے جا رہی ہے۔ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ پانی کہاں مل سکتا ہے؟ اس نے کہا: قریب میں پانی نہیں ہے۔ میں اپنے قبیلے سے ایک دن اور ایک رات کا فاصلہ طے کر کے پانی لا رہی ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک بیوہ عورت ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ہیں۔ ہم اسے لے کر رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ کے حکم پر اونٹنی کو بٹھایا گیا۔ آپ نے مشک پر دست مبارک رکھا۔ تھوڑا سا پانی لے کر اس پر کلی کی۔ اس کے بعد آپ کا یہ معجزہ دیکھنے میں آیا کہ ہم چالیس افراد تھے، ہم سب نے اس سے پانی پیا اور ہمارے پاس جو چھوٹے بڑے برتن تھے، سب بھر لیے۔ ایک صاحب کو غسل کی حاجت تھی۔ انھیں اس کے لیے پانی دیا گیا۔ اس کے باوجود یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مشک اس قدر بھرے ہوئے ہیں کہ پھٹے جا رہے ہیں۔ آپ نے اس عورت سے فرمایا: دیکھو ہم نے تمھارا پانی کم نہیں کیا ہے۔ پھر آپ کے حکم سے ہم لوگوں نے بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اور کھجوریں اسے دیں۔ آپ نے اس سے کہا: جاؤ، یہ اپنے بچوں کو کھلاؤ۔ اس نے اپنے قبیلہ میں پہنچ کر پورا واقعہ سنایا تو سب لوگ اسلام لے آئے۔[1]

حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے شام کے سفر میں ایک نصرانی عورت کے گھر سے گرم پانی لے کر وضو کیا۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب علامات النبوۃ فی الاسلام؛ مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب قضاء الفایت و استحباب تعجیلہ۔ قاضی شوکانی کہتے ہیں: ثبت فی الصحیحین انہ صلی اللہ علیہ وسلم توضأ من مزادۃ مشرکۃ۔ نیل الاوطار: ۱/۲۶ [2] بخاری، کتاب الوضو، باب وضوء الرجل مع امرأتہ۔ قرطبی نے دارقطنی کے حوالہ سے اس واقعہ کی تفصیل نقل کی ہے۔ الجامع لاحکام القرآن: ۱۳/۴۴، ۴۵

امام شافعیؒ نے اس روایت کو یوں نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی عورت کے گھڑے سے پانی لے کر وضو کیا۔[1]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل کتاب کے پانی کو اس تفصیل میں گئے بغیر کہ وہ کس قسم کا پانی ہے، استعمال کیا جاسکتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مشرک کے پانی سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اگر اپنی عبادت کے لیے وضو کرتا ہو تو اس کے بچے ہوئے پانی سے بھی وضو کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر متعین طور پر یہ معلوم ہو کہ پانی نجس ہے تو وضو صحیح نہ ہوگا۔[2]

غیر مسلم کی غذا کا حکم

اب غذاؤں کو لیجیے۔ انسان کی غذا میں کئی طرح کی چیزیں شامل ہیں:

۱۔ بعض چیزیں قدرت کی طرف سے اسے تیار شدہ شکل میں مل جاتی ہیں۔ جیسے پھل اور میوے۔ اس میں انسان کا دخل صرف زراعت، شجر کاری اور آب پاشی وغیرہ کی حد تک رہتا ہے۔ بعض اوقات بغیر محنت کے بھی یہ چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ انھیں اگر کوئی غیر مسلم پیدا کرتا ہے تو اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جس طرح مسلمان کی پیداوار جائز ہے اسی طرح غیر مسلم کی پیداوار بھی جائز ہے۔ یہی حکم گیہوں، چاول اور دیگر غذائی اجناس کا ہے۔

۲۔ بعض چیزیں وہ ہیں جنھیں آدمی ان کی فطری حالت میں بطور غذا استعمال نہیں کر پاتا، اس لیے ان میں اپنی جسمانی حالت، مزاج اور معدہ کی رعایت سے مناسب ترمیم کر کے استعمال کرتا ہے۔ اسی کے لیے وہ گیہوں سے آٹا تیار کرتا اور آٹے سے روٹی پکاتا ہے، یا دانوں سے تیل نکال کر استعمال کرتا ہے۔ اگر یہ خدمات کوئی

---

[1] ابن حجر، فتح الباری: ۱/۲۹۹

[2] ابن حجر، فتح الباری: ۱/۲۹۹

غیر مسلم انجام دے تو مسلمان کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ اگر کوئی اس سے فائدہ اٹھانا نہ چاہے تو بقول علامہ قرطبی یہ اس کی احتیاط ہوگی، جواز بہرحال باقی رہے گا۔[1]

۳- جانور کا گوشت بھی انسان کی غذا میں شامل رہا ہے۔ اسلام کی رو سے حلال جانور کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ اس میں بعض اوقات تقرب اور عبادت کا پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس پر بحث آگے آرہی ہے۔

غیر مسلم کی تیار کردہ غذائی اشیاء

غیر مسلموں کی تیار کردہ حلال مطعومات استعمال کی جاسکتی ہیں۔ احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے:

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پنیر کا ٹکڑا پیش کیا گیا۔ آپ نے چھری طلب فرمائی، اللہ کا نام لے کر اسے قطع کیا اور تناول فرمایا۔[2]

پنیر حجاز میں تیار نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ شام وغیرہ سے آتی تھی۔[3]

حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خیبر میں مجھے چربی سے بھرا ہوا ایک جراب (چمڑے کا تھیلا) ملا۔ میں نے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیا اور کہا کہ میں کسی کو نہیں دوں گا۔ اتنے میں پلٹ کے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ مسکرا رہے تھے۔[4]

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہود کے ذبیحہ کی چربی کا استعمال مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ مالکیہ اور حنابلہ میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ چوں کہ چربی یہود کے لیے حرام تھی، اس لیے ان

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/۷۷

[2] ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب فی اکل الجبن

[3] قاضی شوکانی رسول اللہ ﷺ کے پنیر کے استعمال کے بارے میں فرماتے ہیں۔ اکل من الجبن المجلوب من بلاد النصاریٰ کما اخرجه احمد و ابوداؤد من حدیث ابن عمرؓ، نیل الاوطار: ۱/۲۶

[4] بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب ذبائح اہل الکتاب و شحومها عن الجرب وغیرہم۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب جواز الاکل من طعام الغنیمۃ فی دار الحرب۔

کے ذبیحہ سے نکلی ہوئی چربی ہمارے لیے بھی حرام ہوگی، لیکن امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور جمہور علماء اس کے جواز کے قائل ہیں۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[1]

چربی کو محفوظ رکھنے اور اسے قابل استعمال بنانے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرتے رہے ہوں گے۔ چربی پر مکھن، گھی اور روغن وغیرہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

غیر مسلم کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے

دعوتیں اور تقریباً ہر معاشرت کا ایک لازمی جزء ہیں۔ اس سے خوشی میں شرکت ہوتی ہے، تعلقات استوار ہوتے ہیں اور قربت بڑھتی ہے۔ اسلام نے اس کی ترغیب دی ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دعوت دے تو اسے قبول کرنا پسندیدہ ہے، بلاوجہ اسے رد نہیں کرنا چاہیے[2]

غیر مسلم کے ساتھ بھی کھانا پینا مباح ہے۔ وقت ضرورت اسے دعوت دی جاسکتی ہے اور اس کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے۔ جس معاشرہ میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں وہاں اس طرح کی دعوتوں اور تقریبات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس سے دینی اور سماجی بہت سے فائدے اٹھائے جاسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا:

وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ

ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ (المائدۃ:۵)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ”تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے“ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے اور اسی کو ترجیح حاصل ہے کہ جس طرح تم ان کا ذبیحہ کھاسکتے ہو اسی طرح تم

---

[1] نووی، شرح مسلم، ج ۴، جزء ۱۲، ص ۱۰۲، ۱۰۳، نیز ملاحظہ ہو۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/ ۷۷

[2] ملاحظہ ہو: راقم کی کتاب ’صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات‘ ص ۱۶۹

انھیں اپنا ذبیحہ کھلا سکتے ہو، اس کی ممانعت نہیں ہے[۱]

رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے:

ان یھودیا دعا النبی ﷺ الی خبز شعیر و اھالة سنخة فاجابه[۲]	ایک یہودی نے نبی ﷺ کو جو کی روٹی اور بدبودار چربی (یا تیل) کی دعوت دی۔ آپ نے قبول فرمائی۔

روایات سے ثابت ہے کہ جنگ خیبر کے ختم ہونے کے بعد ایک یہودی عورت نے آپ کے پاس بکری کا گوشت بھجوایا یا آپ کی دعوت کی، اس میں زہر تھا۔ آپ نے لقمہ لیتے ہی اسے تھوک دیا۔ اس کے باوجود اس کا اثر آپ پر ہوا۔ آپ کے ساتھی حضرت بشر بن براءؓ کا اسی سے انتقال ہوگیا[۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے کھانے پینے کا اہتمام بھی فرمایا ہے۔

قبیلہ ثقیف کے وفد کو، جو ابھی اسلام نہیں لایا تھا، آپؐ نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ حضرت خالد بن سعیدؓ اس کے کھانے کا نظم فرماتے تھے۔ وفد کے لوگ حضرت خالدؓ کے کھانے سے پہلے کھانا نہیں کھاتے تھے[۴]

---

۱ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۲۰

۲ مسند احمد: ۳/ ۲۱۱، ۲۷۰

۳ بخاری، کتاب المغازی، باب الشاۃ التی سمت، مع فتح الباری: ۷/ ۴۹۷۔ واقعہ کی تفصیل اور روایات کے اختلافات کے لیے دیکھی جائے: ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۳/ ۳۹۴۔ ۴۰۱۔ نیز ملاحظہ ہو راقم کا مضمون 'تحائف کی سماجی اور سیاسی اہمیت' سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ جنوری-مارچ ۱۹۹۶ء

۴ قبیلۂ ثقیف نے بعض شرائط کے ساتھ بعد میں اسلام قبول کرلیا۔ ابن ہشام: ۴/ ۱۹۴-۱۹۷۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴/ ۵۴-۵۶

غیر مسلم کا ذبیحہ

جانور کا گوشت ہمیشہ سے انسان کی غذا میں شامل رہا ہے۔ اسلام نے حلال جانور کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے۔ اس کے ساتھ بعض شرطیں رکھی ہیں:

۱- حلال جانور بھی مردار نہ ہو، چاہے وہ طبعی موت مرا ہو، یا گلا گھونٹنے، یا چوٹ کھانے سے یا کسی بلند مقام سے گرنے یا دوسرے جانور کے سینگ مارنے اور حملہ کرنے سے اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ (المائدۃ:۳)

۲- اسے ذبح کیا جائے اور اللہ کے نام پر کیا جائے۔ مشرکین کہا کرتے تھے کہ یہ عجیب بات ہے کہ جس جانور کو اللہ نے مارا ہے وہ تو ناجائز ہے اور جسے انسان ذبح کرے وہ حلال اور جائز ہے۔ قرآن نے اس نامعقول اعتراض کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور کہا کہ اللہ کے نام پر جو جانور ذبح ہو اس کے کھانے میں تکلّف نہیں ہونا چاہیے۔ ارشاد ہے:

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ○ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (الانعام: ۱۱۸، ۱۱۹)

پس تم کھاؤ وہ جسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہے۔ اگر تم اس کی ہدایات پر یقین رکھتے ہو۔ آخر تم اس جانور کو کیوں نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے وہ چیزیں بتا دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں۔ (ان میں یہ ذبیحہ نہیں ہے)۔

۳- جو جانور اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کیا جائے اس کا کھانا حرام ہے۔ چناں چہ قرآن نے صراحت کی ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ (الانعام:۱۲۱)

جس جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے اسے مت کھاؤ۔ بے شک یہ فسق ہے۔

۴- اسی وجہ سے جو جانور غیر اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے، جیسے بت پرست قومیں بتوں کے نام سے کرتی ہیں یا استھانوں پر جانور کا چڑھاوا چڑھاتی ہیں، اس کا

کھانا حرام ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ ... وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۷۳) تم پر حرام کیا گیا ہے ...اور وہ جانور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔

مشرکینِ عرب کسی آسمانی شریعت کے پابند نہیں تھے۔ انھوں نے مذہب کے نام پر حلال وحرام کے کچھ خود ساختہ طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ مردار تک کھا جاتے اور ذبح کرتے تو دیوی دیوتاؤں کے نام پر کرتے۔ اس لیے اسلام نے مشرکین کے ذبیحہ کو مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا۔ اس کے برخلاف اہلِ کتاب خدا اور وحی و رسالت کو اصولی طور پر مانتے اور اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ اس لیے ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا گیا۔ چناں چہ ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (المائدۃ:۵) آج تمھارے لیے تمام پاک چیزیں حلال کردی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی اور تمہارا کھانا ان کے لیے بھی حلال ہے۔

آیت میں 'طعام' کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی کھانے کے ہیں۔ اس میں گو عموم پایا جاتا ہے، لیکن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے ذبیحہ مراد ہے[۱] یہی بات متعدد تابعین سے مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، اس لیے کہ وہ غیر اللہ کے نام سے ذبح کو حرام سمجھتے ہیں اور اللہ ہی کے نام سے ذبح کرتے ہیں[۲]

علامہ ابن رشد کہتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔ تفصیلات میں بعض باتوں میں اتفاق ہے اور بعض میں اختلاف[۳]

---

۱ امام بخاری فرماتے ہیں: قال ابن عباس: **طعامهم ذبائحهم**۔ بخاری، کتاب الذبائح والصید

۲ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۱۹

۳ تفصیل کے لیے دیکھی جائے بدایۃ المجتہد: ۴/ ۱۲۶ اور اس سے آگے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کو ناپسند کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کے ذبیحہ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے[۱]

علامہ نووی فرماتے ہیں: اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے حلال ہونے پر اجماع ہے۔ صرف شیعہ حضرات کو اس سے اختلاف ہے[۲] فقہائے احناف نے اس معاملہ میں ذمی اور حربی کا بھی فرق نہیں کیا ہے۔ ان کے نزدیک کتابی چاہے ذمی ہو یا حربی، اس کا ذبیحہ حلال ہے[۳]

ایک سوال یہ ہے کہ نصاریٰ کبھی حضرت مسیح علیہ السلام کے نام پر اور کبھی کسی کنیسہ کے نام پر بھی جانور ذبح کرتے ہیں۔ یہود (کا ایک فرقہ) حضرت عزیرؑ کے نام پر ذبح کرتا ہے۔ اس طرح کے ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟

سلف میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ کس کے نام سے ذبح کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عقائد و اعمال سے واقف ہے، اس کے باوجود جب اس نے ان کا ذبیحہ حلال کیا ہے تو اسے حلال ہونا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صحابۂ کرام میں حضرت ابو درداءؓ اور عبادہ بن صامتؓ کی رائے ہے۔ تابعین میں حضرت عطاء، زہری، ربیعہ، شعبی اور مکحولؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اگر اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر جانور ذبح کریں تو یہ ہمارے لیے حلال نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن نے صاف طور پر اس جانور کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے کھانے کی ممانعت کی ہے جو اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا گیا ہو (الانعام:۱۲۱) تابعین میں حضرت حسن بصری اور طاؤس کی بھی یہی رائے ہے[۴]

---

۱ جصّاص، احکام القرآن: ۱/۳۹۶

۲ نووی، شرح مسلم، جلد ۴، جزء ۱۲، ص ۱۰۲

۳ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵/۳۵۸

۴ نووی، شرح مسلم، جلد ۴، جزء ۱۲، ص ۱۰۲، ۱۰۳۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/۷۶

بظاہر یہی دوسری رائے کتاب وسنت سے زیادہ قریب اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کوئی مسلمان کسی کتابی سے جانور ذبح کرائے تو یہ ذبیحہ جائز ہوگا یا نہ ہوگا۔ امام مالک سے جواز اور عدم جواز دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں۔ جن لوگوں نے اسے ناجائز کہا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے نیت شرط ہے۔ ایک مسلمان اس نیت سے جانور ذبح کرتا ہے کہ اسلامی شرائط کے مطابق جانور ذبح کر رہا ہے وہ اس لیے اس کا ذبیحہ حلال ہے۔ اس طرح کی نیت کتابی کی نہیں ہوتی، جن لوگوں نے اسے جائز قرار دیا ہے انھوں نے یہ شرط تسلیم نہیں کی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے، لہٰذا وہ مسلمان کی طرف سے اس معاملہ میں نیابت بھی کرسکتا ہے[1]

احناف کے نزدیک کسی مسلمان کا کتابی سے جانور ذبح کرانا مکروہ ہے، لیکن ذبیحہ حلال ہوگا[2]

غیر مسلم کے برتن

جو برتن غیر مسلم افراد یا کمپنیاں تیار کرتی ہیں ان کی خرید وفروخت یا استعمال کے مباح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ البتہ جو برتن ان کے استعمال میں ہوں ان کے بارے میں سوال یہ ہے کہ ان کا استعمال صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو اس کے ساتھ کچھ شرائط ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب متعدد احادیث میں ملتا ہے۔

حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم لوگ ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں اہل کتاب ہیں۔ کیا ہم ان کے برتن کھانے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

فان وجدتم غیر انیتھم فلا تاکلوھا و اگر تمہیں ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن

---

[1] ابن رشد، بدایۃ المجتہد: ۴/۱۲۷

[2] ہدایہ: ۴/۴۴۸

ان لم تجدوا فاغسلوھا ثم کلوا فیھا[1]

دستیاب ہوں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ۔ لیکن اگر دستیاب نہ ہوں تو انھیں دھولو، پھر ان میں کھاؤ۔

حضرت ابوثعلبہ ہی سے مروی ایک روایت میں اہل کتاب کے ساتھ مجوس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ حضرت ابوثعلبہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

انا اھل سفر نمرّ بالیھود و النصاری والمجوس فلا نجد غیر انیتھم قال فان لم تجدوا غیرھا فاغسلوھا بالماء ثم کلوا فیھا واشربوا[2]

ہم (ہمیشہ) سفر میں رہنے والے لوگ ہیں۔ ہمارا گزر یہود، نصاریٰ اور مجوس کے علاقوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن نہیں ہوتے (ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟) آپ نے فرمایا: اگر ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن نہ ہوں تو تم انھیں پانی سے دھولو، پھر ان میں کھاؤ اور پیو۔

ایک اور روایت میں ہے:

سئل رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم عن قدور المجوس فقال انقوھا غسلا و اطبخوا فیھا[3]

رسول اللہ ﷺ سے مجوس کے کھانا پکانے کے برتنوں کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ انھیں دھوکر پاک کرلو اور پھر ان میں کھانا پکاؤ۔

حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کی مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم ـــــ چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا مجوس اور بت پرست ـــــ کے استعمالی برتن اس وقت استعمال کیے جانے چاہئیں جب کہ دوسرے برتن دستیاب نہ ہوں اور استعمال سے پہلے انھیں خوب صاف کرلینا چاہیے۔ حضرت ثعلبہؓ ہی کی ایک اور روایت سے اس کی وجہ بھی سامنے آتی ہے۔ اس روایت میں ان کا سوال ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

---

[1] بخاری، کتاب الصید والذبائح، باب صید القوس۔ مسلم، کتاب الصید والذبائح۔ باب الصید بالکلاب المعلّمۃ

[2] ترمذی، ابواب الصید، باب ماجاء مایوکل من صید الکلب وما لایوکل

[3] ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی آنیۃ المشرکین۔

انا نجاور اهل الکتاب و هم یطبخون فی قدورهم الخنزیر و یشربون فی انیتهم الخمر

ہم اہل کتاب کے پڑوس میں رہتے ہیں اور وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے اور اپنے برتنوں میں شراب پیتے ہیں (کیا یہ برتن ہم استعمال کر سکتے ہیں؟)

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

ان وجدتم غیرها فکلوا فیها و اشربوا و ان لم تجدوا غیرها فارحضوها بالماء[1]

اگر تمھیں ان برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن دستیاب ہوں تو تم ان ہی میں کھاؤ اور پیو۔ اگر دوسرے برتن نہ ہوں تو انھیں پانی سے دھوکر صاف کرلو۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ اہلِ کتاب یا غیر مسلموں کے ان برتنوں کا حکم ہے جنھیں وہ حرام اور ناپاک چیزوں کے پکانے اور کھانے پینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ جو برتن ان چیزوں کے لیے استعمال نہ ہوں، ان کے بارے میں یہ حکم نہ ہوگا کہ اہتمام کے ساتھ پاک صاف کر کے بدرجہ مجبوری استعمال کیا جائے۔ اس سے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ اچھی طرح دھودینے کے بعد ہر طرح کے برتن استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے۔ مشرکین کے کھانے پینے کے جو برتن ہاتھ آتے، انھیں استعمال کرتے تھے۔ آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔[2]

ایک روایت میں ہے کہ ہم انھیں دھوکر استعمال کرلیا کرتے تھے۔[3]

امام نووی فرماتے ہیں: حضرت ابوثعلبہؓ کی روایت میں غیر مسلم جن برتنوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے یا شراب پیتے ہیں، ان کے استعمال سے، اگر دوسرے برتن موجود ہوں تو، منع کیا گیا ہے، کیوں کہ اس میں کراہت محسوس ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر برتن فقہاء کے نزدیک دھونے سے پاک ہوجاتے ہیں۔ ان میں کوئی کراہت باقی نہیں

---

[1] ابوداؤد، کتاب الاطعمۃ، باب فی استعمال آنیۃ اہل الکتاب

[2] ابوداؤد حوالہ سابق [3] ابن حجر، فتح الباری: ۹/ ۶۲۳

رہتی۔ آدمی کے پاس اور برتن موجود ہوں تو بھی انھیں وہ استعمال کرسکتا ہے۔[۱]

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ غیر مسلم کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے انھیں دھونے اور بعض صورتوں میں پانی کھولا کر انھیں صاف کرنے کی ہدایت اس لیے ہے کہ وہ نجاسات سے بچتے نہیں ہیں اور مردار کھاتے ہیں۔ دھوئے بغیر پکانے میں برتن مٹی کے ہوں تو ان کے اثرات آسکتے ہیں۔ دھونے اور صاف کرنے کے بعد ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطے کہ برتن سونے اور چاندی کے نہ ہوں یا خنزیر کی کھال سے نہ بنے ہوں (جیسے مشکیزہ وغیرہ) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ضرورت ہو اور برتن تانبے یا لوہے کے ہوں تو انھیں دھو دیا جائے اور مٹی کے ہوں تو اس میں پانی پکانے کے بعد دھو دیا جائے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جو برتن وہ کھانا پکانے کے لیے نہیں، بلکہ دوسری ضروریات کے لیے استعمال کرتے ہیں، انھیں دھوئے بغیر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۲]

علاّمہ عینی فرماتے ہیں کہ کسی غیر مسلم کے برتن سے طہارت (استنجاء، وضو، غسل) حاصل کی جائے اور اس کا پاک یا ناپاک ہونا واضح نہ ہوتو اگر غیر مسلم کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہے جس کے نزدیک اس برتن کے استعمال سے کوئی مذہبی جذبہ یا تقدس وابستہ نہیں ہے تو قطعی طور پر طہارت صحیح ہوجائے گی، لیکن اگر اس کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہے، جس کے نزدیک اس برتن کے استعمال میں کوئی دینی جذبہ یا تقدس پایا جاتا ہے تو اس صورت میں بھی صحیح مسلک یہی ہے کہ طہارت ہوجائے گی۔ امام اوزاعی، ثوری، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب اس برتن کے استعمال میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ امام احمد اور اسحٰق بن راہویہ کے علاوہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے بھی اسے ناپسند کیا ہو۔[۳]

---

۱ نووی، شرح مسلم، جلد ۵، جزء ۱۳، ص ۷۹-۸۰

۲ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۶/۷۸

۳ عینی، عمدۃ القاری: ۲/۳۹۱

غیر مسلم کے کپڑے

غیر مسلم بنکروں یا ان کے کارخانوں کے تیارہ کردہ کپڑے کا استعمال بالاتفاق جائز ہے۔ البتہ ان کے استعمال شدہ کپڑوں کے بارے میں علماء کے یہاں کچھ تفصیل ملتی ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے استعمال شدہ کپڑے، جیسے عمامہ، طیلسان (وہ چادر جو لباس کے اوپر عبا کی طرح اوڑھی جاتی ہے) یا بدن کے اوپر کے حصہ میں استعمال ہونے والے کپڑے، یہ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ جسم کے نچلے حصہ کے لیے جو کپڑے استعمال ہوتے ہیں ان سے احتراز اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ عبادت کے لیے طہارت کا خیال نہیں رکھتے۔ ابو الخطاب کہتے ہیں کہ اصل طہارت ہے، جب تک کسی کپڑے کے ناپاک ہونے کا ثبوت نہ ہو، اسے پاک ہی سمجھنا چاہیے[1]

غیر اہل کتاب، مجوسیوں اور بت پرستوں کے برتنوں اور کپڑوں کے بارے میں ابو الخطاب کہتے ہیں کہ ان کا حکم بھی اہلِ کتاب ہی کا ہے۔ یعنی ان کے کپڑے اور برتن پاک سمجھے جائیں گے اور ان کا استعمال جائز ہوگا، جب تک کہ ان کے نجس ہونے کا یقین نہ ہو۔ یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔

یہ تو استعمالی کپڑوں کا حکم ہے۔ وہ کپڑے جو غیر مسلم تیار کرتے ہیں وہ پاک ہیں، ان میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ یہی کپڑے استعمال کرتے تھے۔ فقہاء کی عام رائے یہی ہے[2]

غیر مسلموں سے معاشرتی روابط کے بعض اور پہلوؤں کی، سماجی تعلقات کے تحت وضاحت ہوسکے گی۔

☆☆

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱/۱۱۱

[2] حوالہ سابق، ص ۱۱۲